ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.2 (2026)
( April to June )

# اُردو ادب اور پیش بینی: تخلیقی ذہن مستقبل کا آئینہ دار

# Urdu Literature and Foresight: The Creative Mind as a Mirror of the Future

اظہر اقبال
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، کلیہ زبان او ادب مائی یونیورسٹی، اسلام آباد

Azhar Iqbal
Ph.D Scholar, Department of Urdu, Faculty of Languages and Literature, MY University, Islamabad.

**Abstract:**
This article examines the relationship between Urdu literature and the concept of foresight, focusing on the creative mind as a reflector of possible futures. Foresight is understood not as certain prediction or supernatural knowledge, but as an intellectual and creative process through which future possibilities are perceived on the basis of historical experience, contemporary circumstances, social trends, political developments, human psychology, and imaginative insight. The study argues that literature does not merely record the past or represent the present; it can also identify emerging changes, warn of potential crises, and imagine alternative social and cultural futures. Urdu poetry, fiction, and novels provide significant examples of this literary future-consciousness. The works and ideas of major literary figures, including Mir Taqi Mir, Mirza Ghalib, Allama Muhammad Iqbal, N. M. Rashed, Faiz Ahmed Faiz, Manto, Ghulam Abbas, Ismat Chughtai, Khadija Mastur, Qurrat-ul-Ain Haider, Abdullah Hussain, Intizar Hussain, Bano Qudsia, and Ibn-e-Safi, demonstrate different forms of creative foresight.

**Key words**: Urdu Literature, Foresight, Literary Foresight, Creative Mind, Future Consciousness, Prediction, Imagination, Social Change, Literary Vision

انسان ہمیشہ سے اپنے مستقبل کے بارے میں جاننے کی خواہش رکھتا ہے۔ ماضی کے تجربات، حال کے حالات اور مستقبل کے امکانات کے درمیان تعلق تلاش کرنا انسانی فکر کا بنیادی حصہ ہے۔ یہی کوشش مختلف علوم، فلسفوں اور فنون میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ پیش بینی بھی اسی انسانی جستجو کا ایک اہم تصور ہے۔ عام طور پر پیش بینی سے مراد مستقبل میں رونما ہونے والے کسی واقعے، صورتِ حال، رجحان یا تبدیلی کے بارے میں موجودہ شواہد، تجربات، مشاہدات، عقلی تجزیے یا تخلیقی بصیرت کی بنیاد پر اندازہ قائم کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، پیش بینی مستقبل کے بارے میں ایک ایسا ممکنہ تصور ہے جو حال کی علامات اور ماضی کے تجربات سے تشکیل پاتا ہے۔ پیش بینی کو مستقبل کا قطعی علم سمجھنا درست نہیں۔ یہ عموماً امکانات کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس لیے پیش بینی اور یقینی پیش گوئی میں فرق کرنا ضروری ہے۔

لفظ پیش بینی دو الفاظ سے مرکب ہے: "پیش" اور "بینی"۔ "پیش" کے معنی سامنے یا آگے کے ہیں، جبکہ "بینی" دیکھنے یا نظر رکھنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے پیش بینی کا بنیادی مفہوم آنے والے حالات یا امکانات کو پہلے سے دیکھنے یا سمجھنے کی

کوشش ہے۔ پیش بینی کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے "ماضی کے تجربات، موجودہ شواہد، مشاہدات، رجحانات اور فکری یا تخلیقی بصیرت کی بنیاد پر مستقبل کے ممکنہ حالات کا اندازہ قائم کرنا پیش بینی کہلاتا ہے۔ عام بول چال میں پیش بینی اور پیش گوئی کو اکثر ایک ہی مفہوم میں لیا جاتا ہے، مگر علمی نقطہ نظر سے ان دونوں کے درمیان فرق موجود ہے۔ پیش گوئی کا تعلق کسی خاص واقعے کے بارے میں ایک واضح دعویٰ کرنے سے ہوتا ہے، جبکہ پیش بینی مستقبل کے ممکنہ حالات اور مختلف امکانات کے تجزیے پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ پیش بینی محض اندازوں یا قیاس آرائیوں پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ اس کی ٹھوس شکل کسی موجودہ حقیقت سے جڑی ہوتی ہے۔ ماضی کے حالات مستقبل کے امکانات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، معاشی بحرانوں کی تاریخ کا جائزہ لینے سے مستقبل کی معاشی پالیسیوں کے ممکنہ اثرات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اعداد و شمار، مشاہدات، تجربات اور موجودہ صورتحال مستقبل کے رجحانات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ادب محض الفاظ کی خوب صورت ترتیب، جذبات کی ترجمانی یا ماضی کے واقعات کا بیان نہیں بلکہ انسانی شعور، معاشرتی رویوں اور مستقبل کے امکانات کو سمجھنے کا ایک مؤثر وسیلہ بھی ہے۔ ایک حساس اور تخلیقی ادیب اپنے عہد کو صرف دیکھتا نہیں بلکہ اس کے اندر چھپی ہوئی تبدیلیوں، رجحانات اور امکانات کو محسوس بھی کرتا ہے۔ یہی صلاحیت ادب میں پیش بینی یا مستقبل شناسی کی بنیاد بنتی ہے۔

اُردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ادوار کے شعرا اور ادبا نے اپنے زمانے کے حالات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ آنے والے معاشرتی، سیاسی اور فکری تغیرات کی طرف بھی اشارے کیے۔ کبھی یہ پیش بینی براہِ راست خیالات کی صورت میں سامنے آئی، کبھی علامت، استعارے، افسانوی کردار یا شعری پیکر کے ذریعے۔ اس اعتبار سے تخلیقی ذہن مستقبل کا آئینہ دار بن جاتا ہے، کیونکہ وہ موجودہ حقیقت کے اندر مستقبل کی تصویر دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اُردو ادب کے مختلف ادبی اصناف میں پیش بینی کا تصور نمایاں ہے۔ شاعری میں یہ مستقبل کی امیدوں، خوابوں اور اجتماعی شعور کے روپ میں ملتا ہے، جبکہ افسانے میں یہ سماجی مسائل کے ممکنہ انجام کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ ناول میں اس کا اظہار وسیع پیمانے پر تاریخی، سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ شاعری الفاظ کی بندش یا جذبات کا اظہار نہیں بلکہ بعض اوقات یہ ایک ایسا آئینہ بھی بن جاتی ہے جس میں مستقبل کے دھندلے خدوخال جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ مشرقی شعریات میں شاعر کو محض لفظوں کا کاریگر نہیں بلکہ ایک صاحبِ نظر اور صاحبِ دل ہستی سمجھا جاتا رہا ہے۔ فارسی و اُردو تنقید میں یہ خیال عام رہا ہے کہ سچا شاعر اپنے عہد کے مزاج، رجحانات اور اندرونی حرکیات کو دوسروں سے پہلے بھانپ لیتا ہے۔ اسی بصیرت کو بعض نقاد "شاعرانہ فراست" کہتے ہیں جبکہ عام قاری اسے "پیش بینی" کا نام دیتا ہے۔ حقیقت میں یہ کوئی مافوق الفطرت صلاحیت نہیں بلکہ گہرے مشاہدے، سماجی و سیاسی حالات کے باریک بینی سے جائزے، اور تاریخ کے دھارے کو سمجھنے کی صلاحیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چونکہ شاعر اپنے معاشرے کے اندر رہ کر اس کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے، اس لیے اکثر اس کے اشعار آنے والے وقت کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

جب کوئی شاعر آزادی کے خواب دیکھتا ہے تو وہ محض خواب نہیں سنا رہا ہوتا بلکہ قاری کے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب افسانہ نگار سماجی ناانصافیوں کو بے نقاب کرتا ہے تو وہ پڑھنے والے کو تبدیلی کے لیے سوچنے پر آمادہ کرتا ہے۔ جب ایک ناول نگار آنے والے ممکنہ خطرات کو تخلیقی انداز میں پیش کرتا ہے تو وہ معاشرے کو ان سے قبل ہی خبردار کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر تخلیقی ذہن صرف مستقبل کا عکس نہیں ہوتا بلکہ وہ مستقبل کی تعمیر بھی کر سکتا ہے۔ اُردو ادب کی حقیقی طاقت اسی تخلیقی بصیرت میں پنہاں ہے۔ ماضی اس کے لیے تجربات کا خزانہ ہے، حال مشاہدے کا مرکز ہے اور مستقبل اس کے تخیل کا افق۔ ایک بڑا ادیب ان تینوں

پہلوؤں کو اس طرح یکجا کرتا ہے کہ اس کی تخلیق اپنے دور سے آگے نکل کر بھی زندہ رہتی ہے۔ لہٰذا، اُردو ادب میں پیش بینی کو کوئی غیبی علم سمجھنے کے بجائے تخلیقی شعور، گہری سماجی سمجھ بوجھ، انسانی نفسیات کے مطالعے اور مستقبل کے امکانات کے ادراک کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تخلیقی ذہن مستقبل کا آئینہ دار بن کر ادب کو آنے والی نسلوں کے لیے ایک فکری روشنی بنا دیتا ہے۔ میر تقی میر اور مرزا غالب کے کلام میں دہلی کی تباہی اور مغلیہ سلطنت کے زوال سے متعلق ایسے اشعار ملتے ہیں جو بعد میں پیش آنے والے حالات سے حیرت انگیز مطابقت رکھتے ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط اور اشعار میں ۱۸۵۷ کے ہنگاموں سے قبل اور بعد میں جس تہذیبی زوال کا نقشہ کھینچا، وہ محض ایک فرد کا نوحہ نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب کے خاتمے کی دور اندیشانہ گواہی معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح میر کے ہاں دلی کی ویرانی اور اجڑنے کا تذکرہ اس وقت کے حالات سے کہیں زیادہ گہرا اور معنی خیز ثابت ہوا۔

اُردو ادب میں اگر 'پیش بینی' کا سب سے بڑا استعارہ ڈھونڈنا ہو تو وہ بلاشبہ حکیم الامت علامہ محمد اقبال ہیں۔ اقبال کے پاس وہ دیدۂ بینا تھی جس نے مغرب کے زوال، کمیونزم کے عروج اور امتِ مسلمہ کی بیداری کی پیش گوئی اس وقت کی جب بظاہر اس کے کوئی آثار نہ تھے۔ علامہ اقبال کی شاعری اس حوالے سے خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ اقبال نے فرد کے اندر موجود تخلیقی قوت، خودی، حرکت اور مسلسل جدوجہد کو مستقبل کی تعمیر سے جوڑا۔ ان کے نزدیک قوموں کا مستقبل محض حالات کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کے فکری شعور، کردار اور عمل سے تشکیل پاتا ہے۔ اس لیے اقبال کی شاعری میں مستقبل ایک جامد منزل نہیں بلکہ مسلسل تخلیق ہونے والی حقیقت ہے۔ اقبال کا تخلیقی ذہن اپنے عہد کے سیاسی اور تہذیبی بحران کو دیکھتے ہوئے ایک نئے انسان اور نئے معاشرے کا تصور پیش کرتا ہے۔ یہی تخلیقی پیش بینی ان کی شاعری کو اپنے عہد سے آگے لے جاتی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری پیش بینی کے حوالے سے انتہائی اہم ہے۔ وہ جمود، غلامی اور ذہنی پستی کے بجائے حرکت، بلند نظری اور خود اعتمادی کی دعوت دیتے ہیں۔ یہاں پیش بینی کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اقبال نے مستقبل کے انسان کو موجودہ انسان سے مختلف اور زیادہ بااختیار تصور کیا۔ ان کے ہاں نوجوان نسل مستقبل کی تعمیر کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اقبال کا یہ شعر

ستاروں　سے　آگے　جہاں　اور　بھی　ہیں
ابھی　عشق　کے　امتحاں　اور　بھی　ہیں(۱)

یہ شعر ایک وسیع کائناتی تخیل پیش کرتا ہے۔ اسے لفظی طور پر سائنسی پیش گوئی کہنا درست نہیں، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کا تخیل انسانی امکانات کو محدود نہیں کرتا۔ انسان کے لیے نئے جہانوں اور نئی دریافتوں کے دروازے کھولنا ان کی فکر کا اہم حصہ ہے۔ علامہ محمد اقبال کی شاعری میں فرد، خودی، حرکت، عمل اور مستقبل کی تعمیر کا تصور بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی کتاب اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں فرد اور ملت کی تعمیر کے حوالے سے جو تصورات سامنے آتے ہیں، وہ مستقبل شناسی کے مطالعے میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک سیاسی مفکر اور بینا شخصیت کے مالک تھے۔ اقبال کی شاعری میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ سیاسی و تہذیبی مستقبل کا تصور بار بار ابھرتا ہے۔ ۱۹۳۰ کے خطبہ الہ آباد میں اُنھوں نے شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کا نظریہ پیش کیا، جسے بعد میں تحریکِ پاکستان کے فکری سرچشموں میں شمار کیا گیا۔ ان کی شاعری میں ملتِ اسلامیہ کے عروج، خودی کے فلسفے اور مشرق کی بیداری سے متعلق جو تصورات ملتے ہیں، انہیں بہت سے محققین نے دور اندیشی اور مستقبل بینی کی روشن مثال قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر اقبال کو محض شاعر نہیں بلکہ "شاعرِ مشرق" اور ایک فکری رہنما کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جس نے اپنے وقت سے کہیں آگے کی سوچ پیش کی۔ اُنھوں نے اپنی وفات (۱۹۳۸ء) سے

بہت پہلے یورپ کے زوال اور روس میں بادشاہت کے خاتمے کی پیش گوئی کر دی تھی۔ اقبال نے ۱۹۰۷ء میں جرمنی اور برطانیہ کے قیام کے دوران مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کو دیکھ کر کہا تھا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا(۲)

یہ پیش گوئی ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم اول کی صورت میں حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ اسی طرح روس میں زارِ روس کی بادشاہت کے خاتمے اور مزدوروں کے عروج کی پیش گوئی اُنھوں نے پہلے ہی کر دی تھی۔ ن۔م۔ راشد کی نظموں میں دورِ حاضر کے انسان کی تنہائی، آزادی، انفرادیت اور وجودی کشمکش کے پہلو واضح نظر آتے ہیں۔ ان کا کلام پرانے معاشرتی ڈھانچوں سے نکل کر ایک ایسے شخص کی عکاسی کرتا ہے جو اپنی پہچان اور خود مختاری کے حوالے سے سوال اٹھاتا ہے۔ یہ موضوع آج کے ڈیجیٹل دور میں پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ اگرچہ موجودہ دور میں انسان کے پاس میل جول کے لاتعداد راستے ہیں، مگر اس کے باوجود تنہائی، بے چینی اور اپنی شناخت کھونے کا خدشہ بڑھتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راشد کی جدید انسان سے جڑی شاعری کو موجودہ دور کے تناظر میں نئے معانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ فیض کی شاعری میں مستقبل کا تصور مزاحمت اور امید سے وابستہ ہے۔ ان کے ہاں موجودہ ظلم کے مقابلے میں ایک ایسی دنیا کا خواب موجود ہے جہاں انسان کو انصاف اور آزادی حاصل ہو۔ فیض کا شعر:

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے (۳)

مستقبل کو امید کے ایک مشترکہ عہد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ فیض کی نظر میں مستقبل کوئی خیالی جنت نہیں بلکہ مسلسل جدوجہد سے حاصل ہونے والی ایک ممکنہ حقیقت ہے۔ ادب کی یہی ایک بڑی خصوصیت ہے کہ ادیب صرف موجودہ حالات کا اندازہ ہی نہیں لگاتا، بلکہ وہ ایک ایسے مستقبل کا تصور بھی پیش کرتا ہے جو ابھی تک حقیقت نہیں بنا۔ میراجی نے اُردو شاعری میں انسانی لاشعور، خواہش، جنس، خواب اور اندرونی تجربات کے نئے پہلوؤں کو متعارف کرایا۔ ان کی تخلیقات اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں کہ آنے والے دور کا انسان محض ٹیکنالوجی کی وجہ سے نہیں بدلے گا، بلکہ اس کی نفسیاتی اور داخلی دنیا میں بھی تبدیلی آئے گی۔ موجودہ دور میں انسانی نفسیات، تنہائی، ذہنی تناؤ، ڈیجیٹل شناخت اور ورچوئل تعلقات جیسے موضوعات نہایت اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔ میراجی کی داخلی دنیا پر مبنی شاعری ان مسائل کا ادراک کرنے کے لیے ایک فکری بنیاد فراہم کرتی ہے۔

مستقبل کوئی ایسی شے نہیں جسے مکمل طور پر یقینی طور پر جانا جا سکے۔ تاہم انسانی تجربات، معاشرتی تبدیلیوں، سیاسی حالات اور تہذیبی رجحانات کا گہرا مشاہدہ مستقبل کے ممکنہ راستوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ ادیب اسی مشاہدے کو تخلیقی قوت میں تبدیل کرتا ہے۔ عام انسان کسی واقعے کو صرف ایک واقعے کے طور پر دیکھ سکتا ہے، لیکن تخلیقی ذہن اس واقعے کے پیچھے موجود اسباب اور اس کے ممکنہ نتائج کو بھی محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادبی تخلیقات اپنے عہد سے آگے نکل جاتی ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے غیر معمولی معنویت اختیار کر لیتی ہیں۔ سرسید احمد خان کی فکر اُردو نثر میں مستقبل شناسی کی ایک نمایاں مثال پیش کرتی ہے۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے صرف ماضی کی عظمت پر فخر کرنا کافی نہیں بلکہ جدید علوم، سائنسی فکر اور نئی تعلیمی ضروریات کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ سرسید نے جدید تعلیم کے فروغ کو مستقبل کی ترقی سے جوڑا۔ علی گڑھ تحریک اسی تصور کا عملی اظہار تھی۔ یہاں پیش بینی کا پہلو بہت واضح ہے۔ سرسید نے اس دور میں جدید تعلیم کی اہمیت کو محسوس کیا جب برصغیر کے ایک بڑے حصے میں

جدید سائنسی تعلیم کے بارے میں شدید تحفظات موجود تھے۔ ان کی فکر نے آنے والی نسلوں کے لیے ایک نئے تعلیمی اور سماجی تصور کی بنیاد رکھی۔ یوں ادیب اور مفکر صرف موجودہ مسئلے کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ آنے والے معاشرے کے لیے ایک راستہ بھی تجویز کرتا ہے۔

اُردو افسانے نے بھی سماجی تبدیلیوں کو سمجھنے اور ان کے ممکنہ اثرات کو اجاگر کرنے میں کلیدی کردار نبھایا ہے۔ جیسے ایک تخلیق اپنے مخصوص تاریخی پس منظر سے نکل کر مستقبل کے انسان کے لیے بھی آئینہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح اُردو افسانے میں شہری زندگی، طبقاتی فرق، عورت کا سماجی مقام، سیاسی جبر، جنگ، ہجرت اور شناخت جیسے موضوعات نے مستقبل کے معاشرتی مسائل کو سمجھنے میں بڑا کردار ادا کیا۔۔ ادیبوں نے ان مسائل کو صرف بیان نہیں کیا بلکہ ان کے انسانی نتائج کی طرف بھی متوجہ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں ہونے والی خونریزی کو ادیبوں نے سالوں پہلے محسوس کر لیا تھا۔ منٹو نے اپنے افسانوں اور خصوصاً 'سیاہ حاشیے' کے خاکوں میں جس وحشت کا ذکر کیا، اس کی جھلک اُنھوں نے تقسیم سے قبل کے معاشرتی رویوں میں دیکھ لی تھی۔ ان کی تحریروں میں پیش بینی کسی مستقبل کی ایجاد کردہ دنیا کی شکل میں نہیں بلکہ انسانی رویوں کی گہری شناخت کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ منٹو نے ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آغاز میں پاکستان کی خارجہ پالیسی اور سماجی زوال کی جو تصویر کشی کی تھی، وہ آج کے دور کے پاکستان کی بالکل درست عکاسی کرتی ہے۔ منٹو نے تحریر کیا تھا۔

> "ہمارے ساتھ فوجی امداد کا معاہدہ بڑی معرکے کی چیز ہے۔ اس پر قائم رہیئے گا۔ ادھر ہندوستان کے ساتھ بھی ایسا ہی رشتہ استوار کر لیجئے۔ دونوں کو پرانے ہتھیار بھیجئے، کیونکہ اب تو آپ نے وہ تمام ہتھیار کنڈم کر دیئے ہوں گے جو آپ نے پچھلی جنگ میں استعمال کیئے تھے۔ آپ کا یہ فالتو اسلحہ ٹھکانے لگ جائے گا اور آپ کے کارخانے بیکار نہیں رہیں گے۔"(۴)

امریکہ پاکستان کو فوجی ساز و سامان تو فراہم کرے گا، ساتھ ہی یہ ہندوستان کو بھی ہے گا۔ دونوں ملک آپس میں لڑتے رہیں گے، امن کبھی بھی نہیں ہو پائے گا۔ منٹو کا یہ بہترین مضمون "چاچا سام کے نام خطوط" (جو کتاب "اوپر نیچے اور درمیان" میں شامل ہے) ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۴ء کے دوران لکھا گیا تھا۔ موجودہ دور میں پاکستان کے سیاسی اور معاشی حالات میں امریکی اثر و رسوخ منٹو کی اسی دور اندیشی کا زندہ ثبوت ہیں۔ درحقیقت، منٹو کی پیش بینی انسانی فطرت کی ہی پیش بینی تھی۔ غلام عباس کا افسانہ "آنندی" اُردو افسانہ نگاری میں سماجی پیش بینی کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے(۵)۔ اس کہانی کے ذریعے شہر کے باشندوں کی اخلاقی ترجیحات، سماجی منافقت اور ظاہری پاکیزگی کے تصورات کو طنزیہ لب و لہجے میں بیان کیا گیا ہے۔ "آنندی" کو محض ایک خاص دور کی داستان قرار دینے کے بجائے شہری معاشرے کی اجتماعی نفسیات کے مطالعے کے طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں بھی جب معاشرے میں اخلاقی اقدار، اجتماعی مفادات اور ظاہری شہرت کے درمیان کشمکش نظر آتی ہے تو یہ افسانہ نئی معنویت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ کسی عظیم ادبی تخلیق کا یہی خاصہ ہے کہ وقت کے ساتھ اس کے سوالات کبھی پرانے نہیں ہوتے۔

اُردو ادب میں عورت کا کردار آنے والے سماجی ڈھانچے سے گہرا رشتہ رکھتا ہے۔ شروع کے اُردو ادب میں عورت زیادہ تر روایتی کرداروں ہی تک محدود تھی، مگر جدید اُردو ادب میں عورت اپنی آواز، سوالات اور اپنی پہچان خود بنانے والی شخصیت کے طور پر ابھری ہے۔ عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسم، خدیجہ مستور اور دیگر خواتین ادیبوں نے عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں

کو اپنے موضوعات میں جگہ دی۔ خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" میں تقسیم سے پہلے کے ہندوستانی معاشرے کی سیاسی اور گھریلو زندگی کے ساتھ عورت کے تجربے کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ ادب اس سوال کی بنیاد فراہم کرتا ہے کہ مستقبل کے معاشرے میں عورت کا مقام کیا ہو گا؟ خدیجہ مستور کا "آنگن" اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں قومی سیاست اور گھریلو زندگی ایک دوسرے سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ گھر کا "آنگن" ایک محدود دنیا کی علامت ہے، لیکن اسی محدود دنیا میں پورے معاشرے کی سیاسی کشمکش منعکس ہوتی ہے۔ یہ تکنیک اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ بڑے تاریخی واقعات عام لوگوں کی نجی زندگی میں کس طرح داخل ہوتے ہیں۔ مستقبل کے مطالعے کے لیے یہ تصور اہم ہے کیونکہ کسی بھی سیاسی تبدیلی کا حقیقی اثر اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب اسے عام انسان کی زندگی میں دیکھا جائے۔

عصمت چغتائی نے اپنے کاموں میں عورت کی زندگی، اس کی خواہشات، سماجی رکاوٹوں اور صنفی فرق کو مرکز بنایا۔ ان کے افسانوں کی آج بھی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ خواتین کے حقوق اور معاشرتی آزادی کے مسائل اب بھی پوری طرح حل نہیں ہو سکے۔ اس تناظر میں ان کا ادب آنے والے وقت کے حوالے سے ایک سوال کھڑا کرتا ہے۔ کیا مستقبل کا معاشرہ عورت کو مکمل طور پر سماجی، معاشی اور ذہنی آزادی فراہم کر سکے گا؟ یہ سوال بذات خود ایک مستقبل شناسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ عصمت چغتائی نے اُردو افسانہ نگاری میں عورت کی نفسیات، امنگوں، سماجی پابندیوں اور صنفی ناہمواری کو بڑی مہارت سے پیش کیا۔ ان کا افسانہ لحاف اُردو ادب میں عورت کی داخلی زندگی اور معاشرتی جبر کے حوالے سے ایک اہم متن ہے۔(۶)

ناول ایک ہمہ گیر صنف ہونے کے ناطے معاشرے کے مختلف طبقات، اداروں اور انسانی رویوں کی گہرائی سے عکاسی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اُردو ناول میں سماجی تبدیلیوں، تہذیبی زوال، جدیدیت، شہری طرزِ زندگی اور فرد کی تنہائی جیسے موضوعات نے مستقبل کے معاشرتی ڈھانچے کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں تاریخ، تہذیب اور انسانی شناخت کا جو وسیع زاویہ نظر آتا ہے، وہ ماضی، حال اور مستقبل کو ایک مسلسل عمل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اسی طرح عبداللہ حسین کے ہاں تاریخ اور انسانی زندگی کے باہمی تعلقات مستقبل کے سوالات کو جنم دیتے ہیں۔ ناول نگار جب ایک معاشرے کی اندرونی تبدیلیوں کو کرداروں اور واقعات کے ذریعے پیش کرتا ہے تو وہ دراصل مستقبل کے ممکنہ سماجی ڈھانچوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" تاریخ، سیاست، جنگ اور تقسیم کے ساتھ انسانی زندگی کے گہرے تعلق کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ ناول ایک مخصوص نسل کے تجربات کے ذریعے اس سوال کو پیش کرتا ہے کہ تاریخی واقعات کس طرح ایک عام انسان کی زندگی کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہی سمجھ مستقبل کے لیے بھی نہایت ضروری ہے، کیونکہ جو معاشرہ تاریخ کے انسانی اثرات کو جانتا ہے، وہ اپنے مستقبل کے فیصلوں کے حوالے سے زیادہ باشعور ہو سکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" اُردو ادب میں تاریخ، تہذیب اور انسانی شناخت کے گہرے باہمی تعلق کی ایک بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں مختلف تاریخی زمانوں کا ذکر کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے یہ واضح کیا کہ اگرچہ تہذیبیں اور سیاسی نظام بدلتے رہتے ہیں، لیکن انسانی سوالات مختلف صورتوں میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ "آگ کا دریا" کا اصل فکری پہلو یہ ہے کہ ماضی کے مطالعے کے بغیر حال اور مستقبل کی مکمل سمجھ حاصل کرنا دشوار ہے۔ یہاں ادب ماضی کا جائزہ لے کر مستقبل کی پیش گوئی کرتا ہے۔

انتظار حسین اُردو افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا وہ معتبر ستون ہیں جنہوں نے انسانی بستیاں اجڑنے، پرانی اقدار کے زوال اور کنکریٹ کے جنگلات کے پھیلاؤ کو اپنی تخلیقات کا مرکز بنایا۔ اپنے افسانوں میں اُنھوں نے کثرت سے یہ منظر کشی کی کہ جب انسان

زمین، درختوں اور فطرت سے دور ہو جائے گا، تو پرندے بھی بستیوں سے کوچ کر جائیں گے اور زمین بنجر ہو جائے گی۔ موجودہ دور جسے "گلوبل وارمنگ" اور "ایکولوجیکل کرائسز" کا نام دیتا ہے، اس کا نوحہ انتظار حسین نے کئی دہائیوں قبل پڑھ دیا تھا۔ ان کے مشہورِ زمانہ ناول "بستی" (۱۹۷۹ء) اور افسانوی مجموعہ "شہرِ افسوس" میں یہ ماحولیاتی اور مابعد الطبیعیاتی پیش گوئی صاف نظر آتی ہے، جہاں شہر اپنی روح کھو کر محض مشینوں اور لاشوں کا ٹھکانہ بن جاتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے اپنے شاہکار ناول "راجہ گدھ" میں ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو آج کی میڈیکل سائنس اور نفسیات کے لیے گہری دلچسپی کا حامل ہے۔ اُنھوں نے پیش گوئی کی کہ جب معاشرے میں معاشی اور اخلاقی کرپشن (حرام کا استعمال) حد سے بڑھ جائے گی، تو یہ انسانی جینز (Genes) کو تبدیل کر دے گی۔ اس کے باعث آنے والی نسلیں ذہنی خلل، ڈپریشن، شدید نفسیاتی دباؤ اور اعصابی بیماریوں کا شکار ہو جائیں گی۔ اکیسویں صدی میں اینٹی ڈیپریسنٹ (Depression) ادویات کے بڑھتے ہوئے استعمال اور ذہنی امراض کی پھیلی ہوئی وبا سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس ناول میں بیان کیا گیا "نظریہ حرام و حلال" اور اس کے حیاتیاتی اثرات کی پیش گوئی بالکل درست ہے۔

جدید دور میں پیش بینی کا تصور سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ مزید اہم ہو گیا ہے۔ مصنوعی ذہانت، ڈیجیٹل دنیا، سوشل میڈیا، روبوٹکس اور تیز رفتار مواصلاتی نظام نے انسانی زندگی کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ ادب ان تبدیلیوں سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور ان کے ممکنہ نتائج پر بحث و مباحثہ بھی کرتا ہے۔ اُردو ادب میں سائنس فکشن کا دائرہ اگرچہ مغربی ادب کے مقابلے میں محدود ہے، لیکن اس کے باوجود مستقبل کی زندگی، جدید ٹیکنالوجی اور انسان و مشین کے باہمی تعلق جیسے موضوعات پر تخلیقی کام موجود ہے۔ آج کا ادیب اس سوال سے دوچار ہے کہ ٹیکنالوجی انسان کو زیادہ آزاد کرے گی یا اسے نئی قسم کی تنہائی اور نگرانی میں مبتلا کرے گی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تخلیقی ذہن مستقبل کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ ادیب نئی ٹیکنالوجی کو صرف حیرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ اس کے انسانی، اخلاقی اور تہذیبی اثرات کا جائزہ لیتا ہے۔

ابنِ صفی کے جاسوسی ناول اُردو کے مقبول ادب میں سائنسی اور تکنیکی تخیل کے حوالے سے اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے ناولوں کے ذریعے جرم، جاسوسی، جدید آلات اور انسانی ذہانت کے باہمی ربط کو ایک تخلیقی انداز میں دکھایا گیا ہے۔ یہ ادب اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عوامی مقبول ادب بھی مستقبل کے سائنسی اور تکنیکی تصورات کو لوگوں کے تخیل میں شامل کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ ابنِ صفی نے بیسویں صدی کے درمیانی دور میں ایسے سائنسی تصورات پیش کر دیے تھے جو اکیسویں صدی میں پہنچ کر حقیقت بن گئے۔ ابنِ صفی کے مشہور "عمران سیریز" کے ناول "خوفناک ہنگامہ" (۱۹۵۴ء) اور "لینڈ کروزر" میں ان جدید ایجادات اور سائبر طرز کی جاسوسی کے ابتدائی خدوخال ملتے ہیں، جب دنیا عام کمپیوٹر سے بھی ناواقف تھی۔ اُنھوں نے اپنے ناولوں میں ایسے کیمیکلز کا ذکر کیا جو انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر کے اسے روبوٹ کی طرح حکم کا غلام بنا دیتے ہیں۔ آج کی دنیا میں اسے 'مائنڈ کنٹرول ڈرگز' اور بائیولوجیکل ہتھیار کہا جاتا ہے۔ اُنھوں نے 'قلم نما پستول'، 'دھوئیں کے بم' اور 'مائیکرو اسپیچ ٹرانسمیٹر' (صوتی آلات) کا استعمال دکھایا۔

ہر تخیل پیش بینی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ادیب ایک خیالی دنیا تخلیق کرتا ہے جس کا موجودہ دنیا سے کوئی تعلق نہیں تو اسے لازماً پیش بینی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اگر تخیل موجودہ حالات، رجحانات یا انسانی رویوں سے جڑا ہوا ہو اور ان کے ممکنہ مستقبل کو ظاہر کرے تو وہ مستقبل شناسی کے قریب آ جاتا ہے۔ مصنوعی ذہانت نے پیش بینی کے تصور کو ایک نئی جہت دی ہے۔ آج مشینیں متن تخلیق کر سکتی ہیں، تصاویر بنا سکتی ہیں، آواز پیدا کر سکتی ہیں اور انسانی زبان کو سمجھ سکتی ہیں۔ اس صورتِ حال نے ادب کے سامنے ایک بنیادی سوال

رکھا ہے اگر مشین تخلیق کرنے لگے تو تخلیق کی انسانی حیثیت کیا ہو گی؟ مستقبل کا اُردو ادب اس سوال کو ناول، افسانے، نظم اور ڈرامے کے ذریعے پیش کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک افسانہ ایک ایسے شاعر کے بارے میں ہو سکتا ہے جس کی تخلیق کردہ شاعری سے زیادہ مقبول شاعری ایک مصنوعی ذہانت تیار کرنے لگتی ہے۔ شاعر کے سامنے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصل تخلیق کار کون ہے: انسان یا مشین؟ یہ مستقبل شناسی کی ایک جدید ادبی صورت ہو گی۔

پیش بینی کی صلاحیت کا تعلق صرف ذہانت سے نہیں بلکہ تخلیقی حساسیت سے بھی ہے۔ تخلیقی ذہن معمولی واقعات میں غیر معمولی امکانات تلاش کرتا ہے۔ وہ معاشرے میں پیدا ہونے والی چھوٹی تبدیلیوں کو محسوس کرتا اور ان کے بڑے نتائج کا تصور قائم کرتا ہے۔ ایک ادیب اپنے عہد کے انسان کی نفسیات، خوف، خواہشات، محرومیوں اور امیدوں کو سمجھتا ہے۔ یہی عناصر مستقبل کے معاشرے کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے ادیب کا تخیل محض خیالی دنیا تخلیق نہیں کرتا بلکہ ممکنہ دنیا کی صورت گری بھی کرتا ہے۔ اس اعتبار سے تخیل حقیقت سے فرار نہیں بلکہ حقیقت کی گہری تفہیم کا ذریعہ ہے۔

اُردو ادب اور پیش بینی کا تعلق دراصل تخلیقی شعور اور انسانی مستقبل کے تعلق کا نام ہے۔ ادیب مستقبل کا غیب دان نہیں ہوتا، لیکن اس کے پاس انسانی رویوں، معاشرتی تبدیلیوں اور تہذیبی رجحانات کو گہرائی سے محسوس کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی صلاحیت اسے مستقبل کے ممکنہ راستوں کا تخلیقی نقشہ بنانے کے قابل بناتی ہے۔ اُردو شاعری، افسانہ اور ناول میں موجود متعدد مثالیں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ادب اپنے عہد سے آگے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کبھی وہ آنے والے خطرات سے خبر دار کرتا ہے، کبھی ایک بہتر دنیا کا خواب دکھاتا ہے اور کبھی انسانی فطرت کی ایسی حقیقت سامنے لاتا ہے جو مختلف زمانوں میں یکساں طور پر معنی خیز رہتی ہے۔ یوں تخلیقی ذہن واقعی مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ وہ مستقبل کو قطعی طور پر بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے ممکنہ چہروں کو ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ قاری ان چہروں میں اپنے عہد کی جھلک بھی دیکھتا ہے اور آنے والے زمانے کا عکس بھی۔ یہی ادب کی سب سے بڑی قوت ہے کہ وہ وقت کی حدود سے تجاوز کر کے انسان کو اپنے حال، اپنے ماضی اور اپنے ممکنہ مستقبل پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ادبی پیش بینی کوئی جادو نہیں، بلکہ یہ ادیب کی 'حسِ لطیف' (Extra Sensory Perception) اور معاشرتی نبض شناسی کا نام ہے۔ جب عام آنکھ صرف 'واقعہ' دیکھتی ہے، تو ادیب کا قلم اس واقعے کے بطن سے جنم لینے والے 'مستقبل' کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ علامہ اقبال، بال جبریل، کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۳۵ء، ص:۶۱

۲۔ علامہ اقبال، بانگ درا، : دنیا پبلی کیشنز، دہلی، ص:۱۹۳

۳۔ فیض احمد فیض، میرے دل میرے مسافر، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۲، ص:۲۲

۴۔ سعادت حسن منٹو، چاچا سام کے نام تیسرا خط، (مشمولہ)، اوپر نیچے اور درمیان، گوشۂ ادب، لاہور، ۱۹۵۴، ص:۲۱۵

۵۔ غلام عباس، آنندی، : مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۴۸، ص:۲۲۹

۶۔ عصمت چغتائی، لحاف، : روہتاس بکس، لاہور، ۱۹۹۲، ص:۱۸


### References in Roman Script:


1. Allama Iqbal, Bal-e-Jibreel, Kapoor Art Printing Works, Lahore 1935, p.61

2. Allama Iqbal, Bang-E-Dara, Duniya Publications, Delhi, p. 193
3. Fiaz Ahmed Faiz, Mere Dil Mere Musafir, Maktabah, Daniyal, Karachi,1982, p.22
4. Saadat Hasan Manto, Chacha Sam Kay Naam Teesra Khat, Mashmula " Upar Neeche Aur Darmiyan, Gosha-e-Adab, Lahore,1954, p.215
5. Ghulam Abbas,, Anandi, Maktaba Jadeed, Lahore,1948, p.229
6. Ismat Chughtai,, lihaf, Rohtas Books, Lahore,1992, p.18